سورج خیال

طلعتِ عرفانی

ناشِر

سُمِت پرکاشن ۸۶ ریلوے کالونی روہتک
ہریانہ

دو لفظ

ہریانہ ساہتیہ اکادمی ریاست کے ادیبوں کی ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے کام میں مصروف ہے۔ ہریانہ کے ادیبوں کو ہندی پنجابی، اردو اور سنسکرت میں ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کو شائع کروانے کے لئے مالی امداد بھی دی جاتی ہے۔

اس اسکیم کے تحت جناب طلعت عرفانی صاحب کی اس کتاب "سورج خیال" کو شائع کرنے کے لئے بھی مالی امداد دی گئی ہے۔ امید ہے اردو ادب میں شغف رکھنے والے حضرات اسے پسند کریں گے۔

روپ نارائن شرما

ڈائریکٹر

ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی

اشاعت اوّل ——— ۱۹۸۵ء

نام کتاب ——— سُورج خیال

مصنّف ——— تلک راج وششٹ المتخلّص

طلعت عرفانی

ہیڈ ٹرین ایگزامینر ریلوے اسٹیشن

روہتک (ہریانہ)

پتہ طباعت ——— سُمِت پرکاشن ای ۷/۸ ریلوے کالونی

روہتک (ہریانہ)

تعداد طباعت ——— پانچسو (۵۰۰)

کتابت ——— ظہیر الاسلام خوشنویس عقب جامع مسجد

گلی کٹ ہیں سہارنپور (یوپی)

قیمت ——— پچیس روپیہ -/۲۵

ملنے کے پتے

۱ - مکتبہ قاری سی ۱۶۱ نارتھ گھونڈہ دہلی ۵۳

۲ - ریلوے بک اسٹال، ریلوے اسٹیشن روہتک (ہریانہ)

یہ کتاب ساہتیہ اکادمی ہریانہ کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے

اِنتسابُ

ضِیَار

کے

نام

طلعت

حمد

بہت کم ہے مری پہچان اے میرے خداوندا!
مجھے بھی دے نظر کا دان اے میرے خداوندا!

سوا اِک نام کے جو کچھ بھی تھا حرفِ غلط نکلا
نہیں باقی کوئی ارمان اے میرے خداوندا!

کوئی جھولی نہیں جس میں تری رحمت سما پائے
کہاں رکھیں ترے احسان اے میرے خداوندا!

جہاں میں جو بھی کچھ ہے صرف تیری ہی امانت ہے
کہ ہم تو ہیں ترے دربان اے میرے خداوندا!

جدھر دیکھیں تجھے دیکھیں جہاں جائیں تجھے پائیں
ملے ایسا کوئی وردان اے میرے خداوندا!

یہ شانِ بے نیازی ان پہ بھی تیرا کرم دیکھا
نہ تھی جنکو تری پہچان اے میرے خداوندا!

اسے اس کے گناہوں کی سزا جو بھی ملی کم تھی
کہ طلعتؔ تھا بہت نادان اے میرے خداوندا!

غزلیں

سوزِ خیال

ذہن سے پیدا ہیں طلعتِ نت نئے سورج خیال
دُھوپ کیسی بھی تھی لیکن سائباں کیسا رہا

وہ جو مجھ میں اک آفتاب سا ہے
آنکھ ہے یا کوئی سراب سا ہے

پانیوں کی صدائیں کون سُنے
پیاس کا جسم تو حُباب سا ہے

شاخ در شاخ جل رہے ہیں درخت
سارا جنگل کسی گلاب سا ہے

جانے کس کے لہُو کی بات چلی
قتل گاہوں میں اضطراب سا ہے

توڑ آیا ہوں آئینوں کے حِصار
پھر بھی اک عکس ہمرکاب سا ہے

کانچ گھر ہو کہ آسماں طلعتؔ
ہر اجالا شکستِ خواب سا ہے

پی کر اداس شام کا نیلا دھواں درخت
منظر کو دے رہے ہیں سنہری زباں درخت
مٹھی میں بند ازل ہی سے شاید کہ تھی بہار
کھلتے ہی بن گئی ہیں مری انگلیاں درخت
جنگل میں پر بریدہ ہوائیں ہیں خیمہ زن
اب موسموں کو ڈھونڈنے جائیں کہاں درخت
خود سے ڈرا ہوا ہے تو ان کو بھی یوں نہ دیکھ
کیا جانے کس خیال کو دیدیں زباں درخت
امشب پھر اس کھنڈر میں چراغاں کی ہے خبر
اندھے کنویں کے پاس اُگا ہے جہاں درخت
نیچے ندی کے پار اُفق پر جھکی ہے شام
اوپر ذرا سا چاند ہے اور درمیاں درخت

طلعت ! زمیں پہ پھر کوئی پتّہ ٹپک پڑا
سُنتے کچھ اور ہو نہ مری داستاں درخت

مٹی اُڑی تو چھت نے عجب فیصلہ کیا
ہر اینٹ کو مکان کی اس کا خدا کیا
مفلوج ہو چکا تھا ہواؤں کا کُل نظام
اِک شور سا نہ جانے کہاں سے اُٹھا کیا
شب بھر میں سارے شہر کے شیشے چٹخ گئے
جاتے ہوئے یہ برف کے موسم نے کیا کیا
ہم تو لباس اتار کے دریا میں ہوئے
اِک بادباں سا خُون کے اندر کھُلا کیا

تو نے جو سبز باغ دِکھائے تھے غیر کو
طلعت ! تمام عمر میں اندھا ہُوا کیا

لکھ کے پتھّر پر مجھے کل شام آوارہ ہوا
دے گئی تم کو ہزاروں نام آوارہ ہوا

اب کوئی کھڑکی ہمارے شہر کی کھلتی نہیں
ہے بہت اس شہر میں بدنام آوارہ ہوا

صرف کاغذ ہی نہیں پتھّر بھی اُڑتے ہیں یہاں
کوئی جب لاتا ہے زیرِ دام آوارہ ہوا

کیا کہیں جنگل میں کتنے پیڑ ننگے ہو گئے
تھک تھکا کر سو گئی جب شام آوارہ ہوا

خاک سے خورشید تک جو کچھ کہیں بھی دیکھئے
بس کہ ہے ہر چیز کا انجام آوارہ ہوا

پھر خرابے میں بھٹکنے پر ہے آوارہ حیات
پھر مجھے روکے ہے زیرِ بام آوارہ ہوا

آج طلعت پھر ہم اس کو ڈھونڈنے نکلے تو ہیں
دیکھئے دیتی ہے کیا انعام آوارہ ہوا

رات کن جزیروں کا درد لے کے آئی ہے
چاندنی کی پلکوں پر اوس تھرتھرائی ہے
شہر شہر پھیلا ہے جنگلوں کا سنّاٹا
جسم کی فصیلوں پر خواہشوں کی کائی ہے
دُھوپ کی پرستش میں ہم نے برف پہنی ہے
اوس کی تمنّا میں ہم نے آگ کھائی ہے
میں نے اُس ہوا گھر میں جب کبھی قدم رکھّا
شام اُتر کے پربت سے مجھ میں آ سمائی ہے
ہے نگاہ میں روشن سبز آنکھ کا جادو
ہر درخت منظر ہے ہر درخت کائی ہے

دشت کے سفیروں کا حشر دیکھ کر طلعت
دُور تک سمندر میں خامشی سی چھائی ہے

اسے بھی چاہنا گھر سے بھی کامراں ہونا
کہاں چراغ سا جلنا کہاں دھواں ہونا

لہو میں جاگ اٹھی ہے پھر آتشِ امکاں
ہر ایک زخم کو لازم ہے جاوداں ہونا

ہم ایک بُت کی پرستش میں یوں ہوئے پتھّر
جبیں کا نام ہوا سنگِ آستاں ہونا

ندی کی راہ میں صحرا نہ تھا کوئی ورنہ
کِسے تھا ظرفِ سمندر کی داستاں ہونا

مرا تو ہونا نہ ہونا سب ایک سا ٹھہرا
ہوا ہے خوب مگر آپ کا یہاں ہونا

ہمیں بھی چھُو کے گذرتی تو ہے ہوا لیکن
یہ ہاتھ بھُول چکے ہیں اب انگلیاں ہونا

چٹخ گیا ہے بہاروں کا آسماں طلعت
گلوں نے سیکھ لیا جب سے تتلیاں ہونا

خود کو یوں اپنے تعاقب میں لگایا ہم نے
شہر اور دشت کا جھگڑا ہی مٹایا ہم نے

جب سے احساس کو آئینہ بنایا ہم نے
رُخِ ہستی کا کہیں عکس نہ پایا ہم نے

دھوپ چپ چاپ سمندر کی طرف لوٹ گئی
جب جزیرے کا اُسے نام بتایا ہم نے

ایک چُپ دُور تک اندر سے ہمیں توڑ گئی
تیری آواز پہ جب دھیان لگایا ہم نے

قرض اِک عکسِ مجسّم کا چکانے کے لئے
دل سی تصویر کو قسطوں میں جلایا ہم نے

سر پہ اب عرش نہ قدموں میں زمیں ہے، طلعت!
یوں ستاروں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہم نے

بستی جب آستین کے سانپوں سے بھر گئی
ہر شخص کی قمیض بدن سے ، اُتر گئی
شاخوں سے برگدوں کی ٹپکتا رہا لہو
اک چیخ آسمان میں جا کر بکھر گئی
صحرا میں اُڑ کے دُور سے آئی تھی ایک چیل
پتھّر پہ چونچ مار کے جانے کدھر گئی
کچھ لوگ رسّیوں کے سہارے کھڑے رہے
جب شہر کی فصیل کنویں میں اُتر گئی
کُرسی کا ہاتھ سُرخ سیاہی سے جا لگا
دم بھر کو میز پوش کی صُورت نکھر گئی
تتلی کے پنکھ پھول کی جنبش نہ سہہ سکے
خوشبو اِدھر سے آئی اُدھر کو گذر گئی

طلعت ! مرے دماغ کی چیخی تھی ایک نس
ساری زمین تند ہواؤں سے بھر گئی

سمندر ہر طرف صحرا بہت ہے
جہاں تک نقش ہو دریا بہت ہے

فصیلِ شب پہ سناٹا بہت ہے
لرز جائے کوئی سایا بہت ہے

دریچے کھڑکیاں سب بند کر لو!
بس اِک اندر کا دروازہ بہت ہے

شبیہیں ناچتی ہیں پانیوں پر
مسلّط جھیل پر کہرا بہت ہے

کڑکتی دھوپ میں چھت پر نہ جاؤ
جھلس جانے کا اندیشہ بہت ہے

کُھلا بندِ قبا اس کا تو جانا
بدن کچھ بھی نہیں چہرہ بہت ہے

مری تکمیل کو طلعت جہاں میں
وہ اِک ٹوٹا ہوا رشتہ بہت ہے

بدن اس کا اگر چہرہ نہیں ہے
تو پھر تم نے اسے دیکھا نہیں ہے
درختوں پر وہی پتّے ہیں باقی
کہ جن کا دُھوپ سے رشتہ نہیں ہے
وہاں پہونچا ہوں تم سے بات کرنے
جہاں آواز کو رستہ نہیں ہے
سبھی چہرے مکمّل ہو چکے ہیں
کوئی احساس اب تنہا نہیں ہے

وہی رفتار ہے طلعتؔ ! ہوا کی
مگر بادل کا وہ ٹکڑا نہیں ہے

ہم تو وابستہ نہ تھے ہرگز کسی کے نام سے
پھر بھی لوگوں نے کہاں جینے دیا آرام سے

پتھر سے لمس پھول سے خوشبو نکال دے
باقی جو کچھ بچے وہ مرے نام ڈال دے

کیا فرق پانیوں میں ہے اس کا نہ رکھ خیال
دریا کی نیکیوں کو سمندر میں ڈال دے

سمتوں کے رُخ پلٹ کے ستاروں سے بات کر
ترچھا پڑے جواب تو سیدھا سوال دے

نعرہ بنا کھڑا ہوں میں کب سے ضمیر کا
کوئی مجھے بھی آکے ہوا میں اُچھال دے

ٹک شیلف سے قمیص کا رشتہ تجھے بتائیں
لیکن ذرا گلے سے یہ ٹائی نکال دے

پوچھے جو کوئی کون ہے طلعت! زباں نہ کھول
مٹی ذرا سی لے کے ہوا میں اچھال دے

کچھ ایسے ڈھنگ سے ٹوٹا ہے آئینہ دل کا
ہر ایک عکس نظر آ رہا ہے ٹیڑھا سا

ہوا جو شخص خود اپنی ہی کوکھ سے پیدا
وہ اپنے قتل کی سازش میں بھی ملوّث تھا

ہر ایک پہلو پہ خود کو گھما لیا میں نے
کسی بھی آنکھ کا لیکن نہ زاویہ بدلا

اُچھل کے گیند جب اندھے کنویں میں جا پہنچی
گھروں کا راستہ بچوّں پہ مُسکرا اُٹھا

میں ہر سوال کا تنہا جواب تھا طلعت!
مرے سوال کا لیکن کوئی جواب نہ تھا

اپنے حصّے کی حقیقت پہ میں شرمندہ ہوں
اور کہنے کو مرا نام خداؤں میں بھی ہے

ہنسی کا سوگ اداسی کا بانکپن بھی گیا
تمہارے عہد میں احساس کا چلن بھی گیا
اَب ایک عمر بدیہی کی کھوج میں بھٹکو!
کہ اب تو ہاتھ سے مایا کا وہ ہرن بھی گیا
وجود و عکس کی الجھن دِماغ میں لیکر
ہم اپنی کھوج میں نِکلے تو پیرہن بھی گیا
اِک ایک لفظ تھا یوں تو نشست پر قائم
پڑھا جو شعر مجھے دعوۂ سخن بھی گیا

کھڑے رہے وہ سماعت کے جال پھیلائے
سکوت بن کے میں طلعتؔ فضا سے چھن بھی گیا

○

یہ پوچھتے ہو تم کہ ہم پر آسماں کیسا رہا
پیاس کا گویا کہ پانی پر نشاں کیسا رہا
ایک چوکھٹ چار اینٹوں پر کھڑی ہلتی رہی
سر جھکانے کو ہمارے آستاں کیسا رہا
اپنی اپنی زندگی تھی اور اپنی اپنی موت
ابکے اپنے شہر میں امن وااماں کیسا رہا
مدّتوں سے ہوں زمانے سے کنارہ کش مگر
تم جو مل جاؤ تو پوچھوں سب کہاں کیسا رہا
رات اپنے چور دروازے پہ جب دستک ہوئی
اک ہیولا سا ہمارے درمیاں کیسا رہا
حاصلِ صحرا نوردی اور کچھ ہوتا تو کیوں
اور اک منظر پسِ منظر نہاں کیسا رہا

ہر نفس یوں تو ازل سے تھا ابد تک اختلاط
اِک شکستہ پَل بکھِر کر درمیاں کیسا رہا
جس نے جو مانگا اسے ویسا ہی چہرہ سونپ کر
آئینہ بے چہرگی کا رازداں کیسا رہا

ذہن سے پیدا ہیں طلعت نِت نئے سوزِ خیال
دھوپ کیسی بھی تھی لیکن سائباں کیسا رہا

ٹپکتا ہے مرے اندر لہو جن آسمانوں سے
کوئی تو ربط ہے ان کا زمیں کی داستانوں سے

دھواں اٹھنے لگا جب سنگِ مرمر کی چٹانوں سے
ستاروں نے ہمیں آواز دی کچے مکانوں سے

سمندر کے پرندو! ساحلوں کو لوٹ بھی جاؤ
بہت ٹکرائے ہو تم ہمارے بادبانوں سے

یہ مانا اب بھی آنتوں میں کہیں تیزاب ہے، باقی
نکل کر جاؤ گے لیکن کہاں بیمار خانوں سے

وہ اندر کا سفر تھا یا سراب، آرزو یارو!
ہمارا فاصلہ بڑھتا گیا دونوں جہانوں سے

لچکتے بازوؤں کا لمس تو پُرکیف تھا طلعت
مگر واقف نہ تھے، ہم پتھروں کی داستانوں سے

○

دل کو دیکھوں تو ! کوئی ارمان شاید ہو
ورنہ یہ بھی آنکھ سا ویران شاید ہو
مجھ کو تو میری اداسی ختم کر دے گی
تو مگر اس بات پر حیران شاید ہو
کھڑکیوں کے یہ سبھی پردے بدل ڈالو!
آ چھپا ان میں کوئی طوفان شاید ہو
ہم تری دیوار سے ہٹ کر کھڑے تو ہیں
پاؤں میں اپنے مگر اب جان شاید ہو
لو! میں سب سمتیں ہوا کے نام لکھتا ہوں
اب مرا مشکل سفر آسان شاید ہو

ساحلوں کے نام تم طلعت! بھلا دینا
ڈوبنے والوں پہ کچھ احسان شاید ہو

سورج کی انگلیوں میں گرفتار میں بھی ہوں
مٹھی بھر آسمان کا حق دار میں بھی ہوں

میں بھی ہوں آنسوؤں کا ترانہ مجھے بھی گاؤ
ہر آن ایک سانس کا اظہار میں بھی ہوں

زہریلی آرزوؤں کے تم ہی نہیں شکار
اپنے لہو کی آگ سے بیزار میں بھی ہوں

عرفانِ ذات سے مجھے پیدا نہیں ہے ربط
ہاں آگہی کے نشے سے سرشار میں بھی ہوں

سینے میں اک عجیب سی تلخی ہے ان دنوں
ورنہ سراپا جذبۂ ایثار میں بھی ہوں

سنگِ صدا اٹھاؤ جو ہاتھوں سے بن پڑے
سیلِ صدائے شمس شرربار میں بھی ہوں

طلعت غزل کی موت پہ رویا کچھ اس طرح
ہر شخص بول اٹھا کہ گنہگار میں بھی ہوں

رنگ لہجے کا کچھ اس درجہ نکھارا جائے
اپنے ہی نام سے اس بُت کو پکارا جائے

کتنی کھوئی ہوئی صدیوں کا پتہ دیتا ہے
ایک وہ پل جو ترے ساتھ گذارا جائے

عین ممکن ہے کہ پا جائے زمانے میں ثبات
دل اگر ذہن کی سُولی سے اُتارا جائے

کوئی پہچان ہی باقی نہ رہی آنکھوں میں
کس کو کس نام سے ایسے میں پُکارا جائے

کیا عجب ہے کوئی خوابیدہ صنم جاگ اُٹھے
اک ذرا غور سے پتھّر کو نہارا جائے

زندگی ایک عجب جنگ ہے جس میں کہ بشر
اپنے ہی آپ سے لڑتا ہوا مارا جائے

ہوں ازل سے میں اسی فکر میں عریاں طلعت
بھیس جینے کے لئے کون سا دھارا جائے

گھاٹ کب لوٹی ہماری ناؤ بھی
ڈھل چکا جب ساحلوں کا چاؤ بھی

ندیو! تم بھی ذرا دم سادھ لو!
بھر چکے کچے گھڑوں کے گھاؤ بھی

آرزو غرقاب ہوتی دیکھ کر
بہہ گئے آدھے ادھورے چاؤ بھی

میں تو مٹی کا کھلونا ہی سہی
تم مری خاطر کبھی چلاؤ بھی!

بھوگ ہی لیتے گئے کی ہم سزا
کاش! چل جاتا ہمارا داؤ بھی

بزم سے جانا ہی تھا ورنہ ہمیں
کیا بُرا تھا آپ کا برتاؤ بھی

تم کہیں سر تھام کر بیٹھے رہو
شہر میں تو ہو چکا پتھراؤ بھی

تن بدل کر ہم سے طلعت نے کہا
کیوں کھڑے ہو اب یہاں سے جاؤ بھی

اِک سنگ جب سکوت کی منزل گذر گیا
سیلِ صدا کے رنگ فضاؤں میں بھر گیا

قطرہ جو آبشار کے دل میں اُتر گیا
پانی کا پھول بن کے فضا میں بکھر گیا

الجھا میں سانس سانس رگِ جاں سے اس قدر
آخر مرا وجود مجھے ، پار کر گیا

سایہ سا اِک اِدھر ہی کو لپکا تو تھا مگر
جانے کہاں سے ہو کے پرندہ گذر گیا

کھڑکی پہ کچھ دھوئیں کی لکیریں سفر میں تھیں
کمرہ اداس دُھوپ کی دستک سے ڈر گیا

چھت پر تمام رات کوئی دوڑتا پھرا
بستر سے میں اٹھا تو وہ جانے کدھر گیا

خوشبو ہوا میں نیم کے پھولوں کی یوں اُڑی
طلعتؔ! تمام گاؤں کا نقشہ سنور گیا

۳۰

بستر کی ہر شکن پہ ہوا کا غلاف تھا
ورنہ مرا وجود تو پہلے ہی صاف تھا

چاروں طرف تھیں گونجتی ریلوں کی پٹریاں
میں جنکے درمیان خود اپنے خلاف تھا

تجھ بن ہمارے پاؤں کو رستہ نہ مل سکا
پانی تو اس ندی کا بڑا پاک صاف تھا

شیشے بہ فیض تشنہ لبی ٹوٹتے رہے
رندوں کا میکدے سے عجب انحراف تھا

پیتے تھے اور گھر کا پتہ پوچھتے نہ تھے
بس اک یہی گناہ تو ہم کو معاف تھا

سلجھا رہے تھے لوگ سب آپس کی الجھنیں
ورنہ جہاں میں کون کسی کے خلاف تھا

مجھ کو اٹھا کے گود میں کیسا ہوا بلند
اوڑھے ہوئے بزرگ جو آیا لحاف تھا

طلعتؔ! غزل کے نام کو پہونچا تو کس طرح
یہ آدمی تو ایک ادھورا زحاف تھا

○

بات جو اب تک نہ ہم سے سر ہوئی
کیا وہ ہم سے بھی کہیں بہتر ہوئی

ڈوبنے والا یہاں کوئی نہیں
آپ کی دریا دِلی کیونکر ہوئی

پیٹ جنّت کا نہ کوئی بھر سکا
بھوک ہر دوزخ کی مُٹھّی بھر ہوئی

ہم ہیں پیاسی جھیل کے ایسے کنول
چاندنی چھو کر جنھیں پتھّر ہوئی

خواب تیری دید کے مندر ہوئے
نیند تیرے نام کی چادر ہوئی

تیرے جاتے ہی نہ جانے کیا ہوا
غیر کی تہمت ہمارے سر ہوئی

سب اُسی کے ہاتھ کا حقّہ ہوئے
چار اُپلے آنچ جس کے گھر ہوئی

موت سے پہلے نہ طلعت مر سکے
پھر بھی موت اپنی یہاں اکثر ہوئی

○

جب بھی ہم کچھ دیر سستانے لگے ہیں
شہر پر آسیب منڈلانے لگے ہیں
کس کا سایہ آپڑا صحنِ چمن پر
کیاری کیاری پھول مرجھانے لگے ہیں
آپ کی اُجلی ہنسی جب بھی سُنی ہے
مندروں کے نام یاد آنے لگے ہیں
پھر زمیں کی ناف ٹیڑھی ہو چلی
پھر سمندر جھوم کر گانے لگے ہیں
آسماں لوہے کا چھلّا ہے جسے ہم
ہر چھوٹی انگلی میں پہنانے لگے ہیں

نیند اب طلعتؔ ہمیں آئے نہ آئے
ادھ کھُلی آنکھوں میں خواب آنے لگے ہیں

کیا طلب ، ہم کو بوقتِ شام ہے
جسم و جاں میں پھر کوئی کہرام ہے
چاند ہے پیاسی ہتھیلی رات کی
ہر ستارہ ایک خالی جام ہے
تیرا ! اے تنگِ نگاہ دوستی !
سُرخرو ہونا خیالِ خام ہے
عشق اپنی وجہِ رسوائی کہاں
وہ تو کوئی اور ہی الزام ہے
دل وہ آسیبی حویلی ہے جہاں
کچھ گذر جائے یہی بدنام ہے
رات آتش داں کے دم پر کاٹ لو
دن تو برفیلی ہوا کے نام ہے

ہم وہ آوارہ پرندے ہیں جنھیں
ہر کہیں آرام ہی آرام ہے

نہ جاگنے کی اجازت ہمیں نہ سونے کی
کہاں سے بات اٹھائیں اذان ہونے کی

تمام گھاٹ کے پانی پہ پھر گئی کائی
جب آئی باری ہماری لباس دھونے کی

ہم اس کے شہر کے رنگوں سے چپ گزر جاتے
یہ کس نے بات چلا دی ہمیں بھگونے کی

کہاں دھوئیں کی پرستش میں جا پھنسے یارو!
یہی تو رُت تھی خیالوں میں آگ بونے کی

حصارِ ذات کے زندانیو! اٹھو جاگو!
یہاں کسی کو اجازت نہیں ہے سونے کی

وہ میری پیٹھ پہ رکھ کر مرا ہی سر بولا
"کسے پڑی ہے کسی کی صلیب ڈھونے کی

میں لمس لمس بکھرتا چلا گیا طلعتؔ!
ملی جو رات اسے روح میں سمونے کی

پیروں کی آگ سر کا سمندر دِکھائی دے
سہمہ نیم اب مجھے ہر ایک پیکر دِکھائی دے

شاید اب آچکا ہوں میں اپنی کلیپیٹ میں
آئینہ اِک وجود کا لشکر دِکھائی دے

خالی مکاں میں اب کوئی آسیب ہی سہی
کھڑکی سے میری کوئی تو منظر دِکھائی دے

اِک شخص شہر چھوڑ کے جب سے چلا گیا
ہر شخص ہم کو شہر میں بے گھر دِکھائی دے

دُوری کا زہر پاؤں سے ہو کر جو سر چڑھے
پھر چاند میں بھی دشت کا منظر دِکھائی دے

طلعت! ہمارے دست شناسوں کا قول ہے
جب ہاتھ کٹ چکیں تو مقدر دکھائی دے

○

نہ کوئی لفظ نہ پیکر نہ رنگ ٹھہرے رہے
ہر ایک خواب طبیعت پہ سنگ ٹھہرے رہے

وہ پھول ہو کہ کھلونا کہ چاند ہو کہ بدن
نظر کی پیاس تو دل کی امنگ ٹھہرے رہے

اسی چٹان پہ کندہ ہے برگدوں کا سکوت
یہیں کہیں کوئی خونی سرنگ ٹھہرے رہے

نہ جانے ثبت ہوں کن کن سمندروں کے نقوش
ذرا سی دیر جس آہن پہ زنگ ٹھہرے رہے

جبیں کے نور سے احساس کے خلاؤں تک
حیات صرف نشے کی ترنگ ٹھہرے رہے

یہ کن اداس درختوں کی چھاؤں میں طلعت
سحر کی اوس میں بھیگی پتنگ ٹھہرے رہے

ملا تھا کل جو ہمیں بحرِ بیکراں کی طرح
بھٹک رہا ہے وہ اب دشت میں فغاں کی طرح

ہمارے بعد زمانے میں جستجو والو!
کرو گے یاد ہمیں سعیٔ رائیگاں کی طرح

اسی کے نام کی تختی تھی سب کواڑوں پر
جو اُٹھ چکا تھا کرائے پہ خود مکاں کی طرح

تو کیسے کیسے غلامی کے دور یاد آئے
ملا جو ہم سے کوئی شخص حکمراں کی طرح

ہم اس کی آنکھ میں ذرّے سے بھی حقیر سہی
ہم اس کے دل میں کھٹکتے ہیں آسماں کی طرح

مری خودی کا سویمبر بھی کیا سویمبر تھا
مری ہی ذات نے توڑا ہے مجھے کماں کی طرح

اب ایک برف کا صحرا ہے اور ہم طلعت
سلگ رہے ہیں سمندر کی داستاں کی طرح

نہ قسط قسط میں یوں داؤں پر لگا مجھ کو
میں تجھ کو ہار چکا ہوں تو ہار جا مجھ کو

سلگ رہا ہوں ازل سے یوں ہی زمانے میں
ہے تیرے پاس کوئی اشک تو بُجھا مجھ کو

عجیب رنگ تھے اس کی ذہین آنکھوں میں
وہ اک نظر میں کئی بار پڑھ گیا مجھ کو

مرے وجود کے لاکھوں ثبوت تھے لیکن
کوئی دماغ بھی ثابت نہ کر سکا مجھ کو

نہ پُوچھ یاس کا عالم کہ تیری دنیا میں
ترا خیال بھی زندہ نہ رکھ سکا مجھ کو

نہ آنکھ آنکھ رہی ہے نہ دِل ہی دِل طلعت!
کسی کے عہد نے پتھّر بنا دیا مجھ کو

○

میں تو ہوں بیمار بہت
مجھ سے مت کر پیار بہت
اِن آنکھوں کی خیر منا
رنگوں کے تیو ہار بہت
موسم ہے سنّاٹوں کا
دے نہ صدائیں یار بہت
پی کے اُداسی منظر کی
دھوپ ہوئی سرشار بہت
رونا تو ہے راتوں کا
دن کے یہاں حقدار بہت
دستِ دعا کیا پھیلاتے
ہم پہ دُعا تھی بار بہت

لوہے کی چھت کو طلعتؔ
مٹّی کی دیوار بہت

سُورج دَھرتی اور آکاش
یہ ہے تین اِکوّں کی تاش
کوھکنو! اب لوٹ چلو!
اِن چہروں کا ستیا ناش
جیب کٹی قدآور کی
بونے بیٹھے قلّاش
'شاید' ہے آغاز اپنا
اور اپنا انجام ہے 'کاش'
میری کہانی کا عنواں
"آگ، سمندر، پھول اور تاش"

اتنے آنسو جذب نہ کر
ہوجائے ساگر قلّاش

آپ کی ساحل پرستی کیا کہیں
ڈوب جانے کو ہے بستی کیا کہیں

جی تو یہ چاہے کہ سب کچھ بانٹ دیں
لیکن اپنی تنگ دستی کیا کہیں

لے اُڑے چاہے جدھر اُن کو ہوا
بادلوں کی فاقہ مستی کیا کہیں

اِک نہتے آدمی کے اِرد گرد
جنگلی آنکھوں کی مستی کیا کہیں

آسماں ہے یا کوئی اندھا کنواں
یہ بلندی ہے کہ پستی کیا کہیں

ہر بشر جیسے کہ ہے خالی دماغ
اس پہ بھی یہ خود پرستی کیا کہیں

جی بہت چاہتا ہے خط لکھنا
لیکن اُس نے لکھا ہے مت لکھنا

چاندنی سا جو کوئی یاد آجائے
جی کو ممبر تو جاں کو چھت لکھنا

زندگی چاہے جس طرح لکھ جائے
تم نہ لیکن ہمیش غلط لکھنا

ہم لکھیں گے اُڑان طائر کی
تم ہوا کی مخالفت، لکھنا

کام کچھ اور بھی تھے دنیا میں
کاش! ہوتا ہمیں فقط لکھنا

نقل کر لو اگر مری تحریر
سوچ کر میرے دستخط لکھنا

شعر طلعت! اگر نہ ہوں نازل
جو بھی آئے غلط سلط لکھنا

شام ڈھلے پربت کو سونپے ہم نے بندھنوار نئے
ست رنگی صبحوں کے کھنچتے کھلتے بندھتے تار نئے
خواہش جیسی اُن آنکھوں میں چاند نہ تھا چوپائی تھی
اور لبوں پر صاف لکھے تھے لذّت کے اظہار نئے
تاج محل کے اس گنبد پر چاند کہاں جا کر ڈوبا
کھول دیئے جب میرے اندر اس نے مرے مزار نئے
کھولو ہاتھ چلے پُروائی! آنے دو بارش بھیگیں!
برقِ بدن سے جھانک رہے ہیں روشن رنگ ہزار نئے

طلعت! یہ دُکھ تو محنت کی روٹی کا اِک حصّہ ہے
بیچ کے اپنے تن کے کپڑے گھر میں رکھ ہتھیار نئے

اپنے حصّے کی حقیقت پہ میں شرمندہ ہوں

اور کہنے کو مرا نام صداؤں میں بھی ہے

دل کہاں دریا ہوا ، دیوار کب ثابت ہوا
پیاس آنکھوں میں اُتر آئی تو سب ثابت ہوا

میں تو مٹّی ہو گیا اس کے لہو کی بُوند پر
وہ مری مٹّی سے یوں اُٹھا کہ رَب ثابت ہوا

رات کی بارش نے دھو ڈالے سبھی کے اشتہار
کون کتنے پانیوں میں ہے یہ اب ثابت ہوا

لوگ پھر کالے دِنوں کے نام خط لکھنے لگے
دھوپ سے ان کا تعلّق بے سبب ثابت ہوا

ہم چُرا لائے تھے معبد سے "خدائے سن کر جسے
وہ کسی ٹوٹے ہوئے بُت کا عقب ثابت ہوا

رنگ تک لا کر ہوا محفل سے خود ہی منحرف
کون طلعتؔ سا بھی یارو بے ادب ثابت ہوا

وہ دھوپ ہے کہ چشمِ تمنّا میں گھاؤ ہے
سایہ مری نگاہ میں تپتا الاؤ ہے

طے کر رہا ہوں اپنی اُداسی کی منزلیں
جینے کا اب تو ایک ادھورا سا چاؤ ہے

کوئی نہیں جو توڑ کے رکھ دے ہوا کا دام
ہر آدمی کے ہاتھ میں کاغذ کی ناؤ ہے

خیگل کو لَوٹ جائیں کہ اب ہوں خلا میں گم
بس دو ہی صورتوں میں، ہمارا بچاؤ ہے

اندر سے دیکھتا کوئی ان کی تباہیاں
باہر تو کچھ گھروں میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے

یارو! ہم اپنے دَور کی تاریخ کیا لکھیں
ہر باشعور شخص کو ذہنی تناؤ ہے

گرنے لگی ہے ٹوٹ کے جاں میں فصیلِ شب
جذبات کی ندی میں غضب کا بہاؤ ہے

طلعت! نظامِ شمس کی تاریکیاں نہ پوچھ

ہر آنکھ میں بس ایک دہکتا الاؤ ہے

یوں کھڑا ہے سورج میں ڈوبا وہ چھوٹا سا درخت
جانتا ہوں جیسے سب منصب ہواؤں کا درخت

اک برہنہ چیخ سنّاٹے پہ تھی ہر سُو محیط
گنبدِ شب میں کھڑا تھا دُور تک تنہا درخت

ہانپتا صحرا زمیں پر کروٹیں لینے لگا
چار چھ پتّوں پہ اٹکا رہ گیا سونا درخت

چاند تو شاید اُفق سے لوٹ بھی آتا مگر
بن چکا تھا اپنے ہی سائے کا خود سایا درخت

دھڑ دھڑا کر گر پڑا بارش میں جب سارا مکاں
بچ گیا آنگن میں چیلوں کو صدا دیتا درخت

شعر طلعت زندگی سے ہم کو یوں حاصل ہوئے
جیسے مٹّی سے غذا پاتا ہے جنگل کا درخت

پیاسے رنگ سلگتی آنکھیں منظر شمس اٹھائیں کیا
ڈھول اُٹی وادی کے پرندے پار ندی کے جائیں کیا

ٹوٹے پُل کے پاس ندی میں چاند ابھی تو ڈوبا ہے
شاخِ بُریدہ پیڑ کو جُگنو شب کا گیت سنائیں کیا

ممکن تھا سب ایک نظر میں صاف دکھائی دے جاتا
لیکن ہم سب سوچ رہے تھے آنکھ سے باہر آئیں کیا

دشمن کی دہلیز نہیں تھی زنجیرِ احساس تو تھی
ورنہ لہو کے رنگ تک آ کر، ہم اور واپس جائیں کیا

ترچھی پیسنی کاٹ نظر کی پاؤں کے تلووں تک پہنچی
دھڑکن ڈوبتے دل کا حال زباں پر لائیں کیا

تیری گلی سے اپنے در تک خون تھوکتے لوٹے ہیں
قرض تری بیمار صدا کا اب ہم اور چکائیں کیا

ساحل پر دہ ہاتھ ہوا میں ہلتے ہلتے جھول گیا
آج سفر کے نام پہ طلعتؔ! ہم پتوار اٹھائیں کیا

بجھا ہے اِک چراغ دل تو کیا ہے
تمھارا نام روشن ہو گیا ہے

تمھیں سے جب نہیں کوئی تعلّق
مرا جینا نہ جینا ایک سا ہے

ترے جانے کے بعد اے دوست ہم پر
جو گذری ہے وہ دِل ہی جانتا ہے

سراسر کفر ہے اس بُت کو چھُونا
وہ اس درجہ مقدّس ہو گیا ہے

کہیں منہ چوم لے اس کا نہ کوئی
وہ شاید اس لئے کم بولتا ہے

ہمیں نے درد کو بخشی ہے عظمت
ہمیں کو درد نے رسوا کیا ہے

حیات اک دار ہے طلعتؔ! کہ جس پر
ازل سے آدمی لٹکا ہوا ہے

جب کوئی سر کسی دیوار سے ٹکراتا ہے
اپنا ٹوٹا ہوا بُت مجھ کو نظر آتا ہے

خوب نسبت ہے بہاروں سے مری وحشت کو
پھُول کھِلتے ہیں تو دامن کا خیال آتا ہے

تم جب آہستہ سے لب کھول کے ہنس دیتے ہو
ایک نغمہ مرے احساس میں گھُل جاتا ہے

کتنے پیارے تھے ترے نام کے دو سادہ حرف
دل جیسے گرنغمہ تنہائی میں دہراتا ہے

آپ سے کوئی تعارف تو نہیں ہے لیکن
آپ کو دیکھ کے کچھ یاد سا آجاتا ہے

ہائے! کیا جانئے کس حال میں ہوگا کوئی
آج رہ رہ کے جو دل اس طرح گھبراتا ہے

آپ کہتے ہیں تو جی لیتا ہے طلعتؔ ورنہ
کون کمبخت یہاں سانس بھی لے پاتا ہے

کون پکائے ان کے نیک ارادوں کو
پچی شہرت مار گئی شہزادوں کو
رنگ برنگی کیلیں اُگیں ہواؤں سے
دن جب سونپا ہم نے تیرے وعدوں کو
اب شیشے کے ویسے روشندان کہاں
دل میں جو رکھ لیں پتھّر سی یادوں کو
جانے کیسے وقت ندی کا پُل ٹوٹا
لوٹ لیے سب پانی کی فریادوں کو
ساحل کا لاجادو سبز ہواؤں کا
نیلے کھیل سکھائے سُرخ مرادوں کو

تختی تیر رہی ہے کالے پانی پر
طلعت! خاک ملے عزّت استادوں کو

سمندر آنکھ تھا ساحل نگیں تھا
ہماری پیاس کو رستہ نہیں تھا
عجب سی دھن لگی تھی مچھلیوں کو
کہ پانی آگ تھا شاید نہیں تھا
سروں پر کشتیاں اُلٹی پڑی تھیں
سفر کا نصف پر زیرِ زمیں تھا
لہو میں خوف کی پرواز سی تھی
بدن پر وہم کا سایہ یقیں تھا
پروں پر نقش تھا سوزِ تخیّل
جنوں موسم زدہ جانِ حزیں تھا
کنارے چل رہے تھے پانیوں پر
کہ میں کشتی میں تھا لیکن نہیں تھا

مری آواز کو سَو الجھنیں تھیں
کہ میں الفاظ کا طلعت ابیں تھا

درد کی سب ساعتیں اشکوں کی تحریریں تمام
دشتِ وحشت میں ہوئیں اس بُت کی تصویریں تمام

کانچ سا کچھ ٹوٹتا رہتا ہے مجھ میں روز و شب
ہو چلیں شاید مرے خوابوں کی تعبیریں تمام

پھر صدائے حق ہوئی شاید کہیں مقتل رسید
پھر ہوئیں مجھ سے مخاطب میری زنجیریں تمام

عمر بھر دیکھا کئے ہم زیست کا ردِّ عمل
بے دلی کو سونپ کر نا خن کی تدبیریں تمام

لوگ جن کو دیکھتے تو ہیں مگر پڑھتے نہیں
میری پیشانی پہ لکھّی ہیں وہ تحریریں تمام

تیرے ہونٹوں سے غزل کو ہے اِذنِ سخن
تیرے گیسو کے تعلّق سے ہیں تحریریں تمام

چاند نے ڈالی فلک پر جب ستاروں کی کمند
جُھک گئیں آفاق پر سُورج کی شمشیریں تمام

دکھ سمندر کا ہوا نے اور بھی گہرا کیا
ڈھانپ لیں کہُرے جب ساحل کی تصویریں تمام

مملکت طلعت! کسی کی ہو ہمیں کیا واسطہ
ہم نے لکھّی ہیں غزل کے نام جاگیریں تمام

اک ہری ٹہنی گری تالاب میں
اس پہ ڈیرہ خشک پتّوں کا لگا

دیکھو تو ہمیں دل نے کیسی یہ سزا دی ہے
آئینہ وہیں پر ہے، دیوار ہٹا دی ہے

الفاظ کے جادو نے سر کاٹ دیا بَن کا
تحریر یہ مٹّی کی کس شئے نے جلا دی ہے

چھوتے ہی تمھیں ہم تو اندر سے ہوئے خالی
برتن نے کہیں یوں بھی پانی کو صدا دی ہے

اب لمس اندھیرے کی اینٹوں کا ہے متکلّم
ناخن نے مرے بڑھ کے ہر بات بڑھا دی ہے

لگ جائیں گی آنکھیں بھی اِک روز کناروں سے
خوشبُو تو ترے خط کی دریا میں بہا دی ہے

ہنگامۂ عدالتِ دُنیا بنا رہے
کیا کیا ہوئے ہیں جُرم سزاؤں کے نام پر

بھلا کیا یہ بھی ہو سکتا ہے جب موسم بدل جائے
تجھے آواز دیں ہم اور تو واپس نہ آ پائے

پرندہ جب مری پہچان سے باہر چلا جائے
مجھے آواز دینا لوٹ کر شاید وہ پھر آئے

یہی تو بات ہے تم نے مرا ہونا نہیں مانگا
وگرنہ زندگی اور یُوں مجھے ٹھوکر لگا جائے

کوئی شے اس طرف اب کیوں ہماری منتظر ہو گی
ہم اپنے شہر کی آتے ہوئے دیوار اٹھا آئے

ہری تتلی کے نیلے پنکھ پر برفاب سی چپ ہے
کوئی پتہ کہیں ٹوٹے تو اب شاید ہوا لائے

بہت کمہلا گئے ہیں پھول پانی دو ہوا لاؤ!
کوئی سورج کرن چل کر کہیں واپس ہو جائے

ہم اپنی آگ کو یارو! کہاں اب جل کے دفنا دیں
ہمارے نام پر جاتے ہیں سُورج چاند گہنائے

سفر اس ابر کے ٹکڑے، دیکھے تو کوئی طلعت!
جو کچی دھوپ کو پی کر سحر کا چاند بنجائے

ایک بے موسم کی بارش نے سبھی کو آ لیا
لوگ سب یک لخت چابی کے کھلونے ہو گئے

ننگ منگی دیواریں سب کمرے جھجّے خالی رام!
بالکنی میں آ بیٹھا ہے پھر اندھا چوپالی رام

اب شاید تالاب پہ لٹکی اِن شاخوں کی باری ہے
بوڑھا برگد پتّے کھا کر بیٹھا کرے جُگالی رام!

چھاتی میں چھتّہ سا گھومے آگ لگے پُروائی کو
میں کس کس کے ڈنک نکالوں ٹوٹ رہی ہے ڈالی رام!

سارا عالم اب تو ہم کو ناگ پھنی کا بُوٹا ہے
سینچ کے اس زہری پودے کو سُوکھ چکے سو مالی رام!

کس نے کیا کیا بھیس بھرا ہے سب تم کو معلوم تو ہے
جینے مرنے کا دکھ پھر کیوں بنکر بیٹھے سوالی رام؟

شہر کے اس کالے جنگل میں کون کہاں دم لیتا ہے
مٹی گارا ہانپ رہے ہیں لیلا عجب نرالی رام!

بھیتر باہر چاند اُگا کر تم کس کس کو پُوجو گے
بہتر ہے اب چُھپ کر دیکھو! دنیا کی دیوالی رام!

میں اَچھوت ہوں میری انگلیاں ناچ رہی ہیں پانی پر
اور لہُو میں ٹوٹ رہی ہے لوہے کی اک جالی رام!

مایا ممتا کے رشتوں سے طلعت کو انکار نہیں
تیرا پیار سپن جگ موہن میرا پیار خیالی رام

سارے زینے اتر گئی خوشبو
ہاتھ لگتے ہی مر گئی خوشبو

اب وہاں برف ہے، نہ چھاؤں نہ دُوب
پربتوں سے اُتر گئی خوشبو

دھوپ نے چھو لیا کوئی اک پھول
ڈالی ڈالی ٹھہر گئی خوشبو

چھین کر ہم سے آئینہ اس نے
خود کو دیکھا تو اُڑ گئی خوشبو

لوگ اندھے سفر سے ڈرتے رہے
ہم کو لے کر گذر گئی خوشبو

ہم کو جنگل میں راستہ دیکر
خود نہ جانے کدھر گئی خوشبو

ہاتھ ملتی رہی ہوا طلعت!
اور اُفق پار گئی خُوشبو

وہ پُل جو کبھی ٹوٹ لے دریا نہ ہوا تھا
بارش سے میری آنکھ میں کیا کیا نہ ہوا تھا

مانا کہ تو شیشوں کا مسیحائے زماں ہے
میں بھی کسی پتھر سے تو پیدا نہ ہوا تھا

ہر چیز وہاں ریت کے ڈھیروں میں دبی تھی
اِک گاؤں کا جو ہرا تھا جو صحرا نہ ہوا تھا

چہروں سے عیاں ٹوٹتے رشتوں کی تھکن تھی
اس گھر میں کبھی روز سے جھگڑا نہ ہوا تھا

ہر شخص کہ چکر میں تھا اپنی ہی اَنا کے
ویسے تو وہاں کوئی کسی کا نہ ہوا تھا

بیمار اُجالوں کی بڑی دھوم تھی لیکن!
اس شہر میں تو کوئی بھی اندھا نہ ہوا تھا

اس بھیڑ میں طلعتؔ! میں تجھے چھوڑ تو آیا
پھر اپنے ہی گھر لوٹ کے جانا نہ ہوا تھا

سورج کو ڈوبنے سے بچاؤ کہ گاؤں میں
تالاب سوکھ جائے گا برگد کی چھاؤں میں

اترے گلے سے زہر سمندر کا تو بتائیں
گنگا کہاں چھپی ہے ہماری جٹاؤں میں

کیا ہی بُرا تھا نور کا چسکا کہ دوستو!
ہم جل بجھے حیات کی اندھی گپھاؤں میں

سر سے کچھ اس طرح وہ ہتھیلی جدا ہوئی
سرخی سی پھیلنے لگی چاروں دشاؤں میں

چھٹتا نہیں ہے جسم سے یہ گیروا لباس
ملتے نہیں ہیں رام بھرت کو کھڑاؤں میں

روزِ ازل خدا سے عجب واسطہ پڑا
تجھ بن بھٹک رہے ہیں ہم اب تک خلاؤں میں

دل تو خوشی کے مارے پرندہ سا ہو رہا
دیکھا جو ہم نے چاند کو چھپ کر گھٹاؤں میں

طلعت! ہر ایک شخص کہیں کھو کے رہ گیا
گونجے جب آنسوؤں کے ترانے فضاؤں میں

قطرہ جب قندیل ہوا
منظر کُل تبدیل ہوا
دُھوپ اُڑی جنگل جنگل
سایا سایا چیل ہوا
اب ہم سانس کہاں سے لیں
بند ہوا میں نیل ہوا
وہ میرا ہمراز کہاں
میں جس کی تفصیل ہوا
ہم نے تجھے چھونا چاہا
موسم کیوں تبدیل ہوا

طلعت جیسا بنجارا
شہروں شہروں ذلیل ہوا

پانی میں جو بھی کچھ تھا ہواؤں کے نام پر
سب دُھل کے رہ گیا ہے فضاؤں کے نام پر

نچّے بدن پہ پھول کھلانے نکل پڑے
موسم بدل رہا تھا گھٹاؤں کے نام پر

تجھ بن نہ پوچھ میرے مسیحا کہ زندگی
بیتی ہے کیسے زہر دواؤں کے نام پر

دن بھی ہمارے راکھ کے بستر سے کم نہیں
راتیں بھی جاگتی ہیں چتاؤں کے نام پر

اس گھر کو کچھ ہوا ہے کہ ہیں ہی نشے میں ہوں
دیوار گھومتی ہے دشاؤں کے نام پر

ہنگامۂ عدالتِ دنیا بنا رہے
کیا کیا ہوئے ہیں جرم سزاؤں کے نام پر

اک بوالہوس کی آنکھ کا مارا ہوا یہ شہر
زندہ ہے صرف چند قباؤں کے نام پر

طلعت! کہاں گئے، وہ پرندے کہ دشت میں
جلنے لگے درخت صداؤں کے نام پر

اٹھیں جو زرد اُجالوں کی انگلیاں ہم پر
سحر کے نام پہ جھونکا گیا دھواں ہم پر

برس پڑے نہ اچانک تمھاری آنکھوں سے
جُھکا ہوا ہے کئی دِن سے آسماں ہم پر

چُرا تو لائے ہیں چپکے سے ہم تری چھت سے
کہاں پھٹے گا نہ جانے یہ آسماں ہم پر

کبھی جو ہم پہ کُھلے چاندنی کے دروازے
فلک سے ٹوٹ کے آئی ہے کہکشاں ہم پر

غزل کے نام پہ بارود لکھ دیا طلعتؔ
اڑا کریں گی ہماری ہی دھجیاں ہم پر

آپ سے مانا مرا انکار زندہ ہوگیا
جسم سے جاں تک مگر آزار زندہ ہوگیا

رات چوراہے پہ اک پتھر کا بُت اتنا ہنسا
شہرِ بے بنیاد کا بازار زندہ ہوگیا

پھر کوئی سُرخی پلٹ آئی کہیں سے گھوم کر
مدّتوں سے مر چکا اخبار زندہ ہوگیا

تم جسے بے جا سمجھتے تھے فسانے کیلئے
دیکھ لو آخر وہی کردار زندہ ہوگیا

ایک چُپ سی یوں سرِ بزمِ سخن وارد ہوئی
ہر غلط آواز کا اظہار زندہ ہوگیا

شام جب ٹوٹا افق پر ڈوبتے سورج کا رتھ
آسماں پر دُھول کا انبار زندہ ہوگیا

میں نہتا ہوگیا طلعت! عدو کی موت پر
وہ مگر چھُو کر مری تلوار زندہ ہوگیا

یہ جو خالی گلاس ہے پیارے!
کتنے ہونٹوں کی پیاس ہے، پیارے!

کچھ پہن لے اتر ہی جائے گا
کوئی دن کا لباس ہے پیارے!

کاش سُنتا کوئی ترے منہ سے
کون کِتنا اُداس ہے پیارے!

جو نہیں ہے وہ کیا خبر کیا ہو
جب کہ جو ہے قیاس ہے پیارے!

سانس اُلجھے نہ کیوں رگِ جاں سے
زخمِ دل کا لباس ہے پیارے!

کل تو کچھ بھی نہ کام آئے گا
آج ہی کی سب آس ہے پیارے!

کس سے ملئے کہ اِن دِنوں طلعت
ہر کوئی خود شناس ہے پیارے!

کیں ہم نے خود نمائی کی تیاریاں بہت
لیکن تھیں آئینوں کی بھی دشواریاں بہت

جنگل تمام اُن کی حماقت پہ ہنس پڑا
لائے تھے مٹھیوں میں جو چنگاریاں بہت

بارش میں اس مکان کے گرنے کے باوجود
کھڑکی سے جھانکتی رہیں کلکاریاں بہت

کہرے نے مندروں کے کلس تک بجھا دیئے
ورنہ وہاں تھیں دھوپ کی گلکاریاں بہت

چہرے کو میں ضمیر کا مقتل نہ کر سکا
گو چشمکوں میں ٹوٹ گئیں یاریاں بہت

طلعت ! کسی بھی سمت نے اُن کا دیا نہ ساتھ
کرتے تھے جو ہوا کی طرفداریاں بہت

تیر کے ہاتھ اگر کماں ٹھہرے
بے حقیقت ہر اک نشاں ٹھہرے

جب تہی ظرف آسماں ٹھہرے
اک ستارا کہاں کہاں ٹھہرے

پشت در پشت آتشیں تحریر
خانہ خانہ دھواں دھواں ٹھہرے

اُن جزیروں میں دھوپ کیا معنیٰ
جن میں صحرا نہ سائباں ٹھہرے

حرف و آواز کی جسارت کیا
درد آخر تو بے زباں ٹھہرے

۷۴

چاندنی کا طلسم کیا کہیے!
نغمۂ شب سکوتِ جاں ٹھہرے

ملگجے خواب دُودھیا بستر
جسم کا رنگ رس جہاں ٹھہرے

ہم کہ طلعتؔ! ہیں اہل دل ہم سے
کیوں نہ ہر آنکھ بدگماں ٹھہرے

اِک پرندے کی ڈُوبتی آواز
موسموں کو اُداس کر جائے

شیشہ نہیں، خیال نہیں آسماں نہیں
روشن مرے ضمیر سا تیرا جہاں نہیں

کیا ہے کہ تیرے دُکھ میں سلگتے تو ہیں مگر
اٹھتا ہماری آنکھ سے پھر بھی دھواں نہیں

کچھ خون سا ٹپک تو رہا ہے یہاں وہاں
ملتا کسی بھی پاؤں کا لیکن نشاں نہیں

تیرے طواف میں جو مزے تھے سو ہو لئے
اب تو کسی بھی سمت کا ہم کو گماں نہیں

طلعتؔ! ملازمت بھی اور شاعری بھی ہے
کچھ لوگ پوچھتے ہیں کہاں ہوں کہاں نہیں

روشنی کچھ کم کرو، آنکھوں کو اندازہ تو ہو!
سامنے گر تم نہ آپاؤ تو دروازہ تو ہو!

آج پھر ہم نے تمہیں خوشبو کے ہاتھوں چھو لیا
تاکہ اپنی زلف کا تم کو بھی اندازہ تو ہو!

گھومنے دو! خالی برتن کی طرح دنیا کہ ہم
اس کو ٹھکرا کر چلے جائیں تو آوازہ تو ہو!

دھڑکنیں کچھ بھی کہیں ہونا ہے مجھ کو منتشر
اب تو آجاؤ! کہ کچھ سانسوں کا شیرازہ تو ہو!

زرد چہرے ڈھونڈنے آتے ہیں مجھ کو بار بار
ہاتھ اگر مٹی نہیں آتی مرے غازہ تو ہو!

شہر چھوڑنا پڑ نہ جائے کیوں ہماری آنکھ میں
آسماں گیری کا یاروں پر بھی خمیازہ تو ہو!

گھر میں کیا کچھ تھا مگر سب کیا ہوا کچھ یاد کر!
طاقتِ بے مہر تیرا کوئی غم تازہ تو ہو!

آئے تو تھے اناج کے چکّر میں گاؤں ہم
چپ ہو گئے ہیں دیکھ کے پیپل کی چھاؤں ہم

سیلاب لوٹتے ہوئے سب کر گیا تباہ
پیڑوں سے ناپتے پھرے ظالم کے پاؤں ہم

اِس جھیل میں کہ رات کو کھلتے نہیں کنول
کیچڑ سے دھو رہے ہیں ستاروں کے پاؤں ہم

وہ روشنی ملی ہے محبّت کے فیض سے
ہر دل میں دیکھتے ہیں اُجالوں کے پاؤں ہم

طلعت! کرے گا یاد تمنّا کا شہر شہر
لوٹیں گے گھوم گھام کے جب اپنے گاؤں ہم

اِک شبِ تاریک ہم منزل پہ یوں لائے گئے
قید سے چھوٹے تو اک مقتل میں پہنچائے گئے

ایک تابندہ کرن کی آرزو کے جُرم میں
سینکڑوں سورج مرے سینے میں دہکائے گئے

ہر قدم پر خُون بکھرا تھا ہماری راہ میں
غالباً کچھ لوگ اِدھر پہلے بھی لے جائے گئے

مِل گیا دنیا کو میرے قتل کا آخر سُراغ
میں جہاں پر کھو گیا تھا تم وہیں پائے گئے

چشمِ تر میں آج بھی زندہ ہے طلعتؔ وہ گھڑی
جب صلیبوں پر مرے جذبات لٹکائے گئے

گر آسماں کو ضد ہے کہ مٹی میں دم نہیں
جوشِ نمو کو نالۂ شبنم بھی کم نہیں

گھلنے لگی ہیں خون میں پتّوں کی زردیاں
اب کے ہمارا حال گلستاں سے کم نہیں

اس کارواں کے لوگ بگولوں میں جا ملے
صحرا میں اب تو ایک بھی نقشِ قدم نہیں

تم جانو! سر پھرا ابھی ہوں ضدی بھی ہوں مگر
توڑی تمہارے پیار کی میں نے قسم نہیں

طلعت! بدن بدن میں ہیں زخموں کے خلفشار
اس پر بھی ہم کو آتشِ امکاں بہم نہیں

سوچ آنکھوں میں گڑی ہو جیسے
بات ہم سے بھی بڑی ہو جیسے

دور تک دل میں نہیں کوئی امید
راہ سنسان پڑی ہو جیسے

الجھی الجھی سی ہے ہر شخص کی بات
گانٹھ ہر دل میں پڑی ہو جیسے

چاندنی آج ترے آنگن میں
چھپ کے دنیا سے کھڑی ہو جیسے

یوں پریشاں ہے سمندر کا وجود
آنکھ قطرے سے لڑی ہو جیسے

کیل شیشے سے پرے ہے لیکن

پھر بھی شیشے میں گڑی ہو جیسے

کھل کر نہ رو سکے نہ کبھی مسکرا سکے
ہم اپنی بے بسی پہ ترس بھی نہ کھا سکے

بھولے سے بھی تمھیں نہ کبھی یاد آئے ہم
بھولے سے بھی تمھیں نہ کبھی ہم بھلا سکے

دل کے ہزار زخم پکارا کئے مگر
تم اس طرح گئے کہ پلٹ کر نہ آ سکے

اک آئینے کی زد میں کٹی عمر اس طرح
ہم اپنا منھ کبھی نہ کسی کو دکھا سکے

کچھ دوستوں نے اس طرح ہم کو دئے فریب
خود پر بھی اعتبار کبھی ہم نہ لا سکے

دیکھا تھا ایک بار انھیں طلعتؔ کہیں اداس
پھر اس کے بعد ہم نہ کبھی مسکرا سکے

چاند پتھر ہو گیا شبنم دھواں ہونے لگی
رات پھر گویا مرے غم کی زباں ہونے لگی

دل ہوا پھر سے کچھ آسیبی ہواؤں کا اسیر
پھر مری ہستی کوئی خالی مکاں ہونے لگی

ڈوب جانے کو اب ان آنکھوں میں ہے کل کائنات
ختم لو! ہم پر جہاں کی داستاں ہونے لگی

ایک آہٹ سی بلاتی ہے مجھے زیر زمیں
لا صدائی دہر کی مجھ پر عیاں ہونے لگی

پھر مرا ہونا نہ ہونا ایک سا ہونے لگا
پھر صدائے جاں سکوتِ جاوداں ہونے لگی

ہم بھی طلعتؔ! کون سے دورا دب میں آپڑے
بات بھی جب فکر و فن کی رائیگاں ہونے لگی،

عالم ہستی اب اِک آئینہ خانہ سا لگے ہے
ہر نیا منظر ہمیں صدیوں پُرانا سا لگے ہے

جُھوٹ سچ کے دائرے میں کون کس کا ہمنوا ہے
تیرے میرے آنسوؤں میں بھی ترانہ سا لگے ہے

لوگ ہر گھر میں عجب سی دشمنی کو جی رہے ہیں
پھر بھی لہجہ ہے کہ دل کو دوستانہ سا لگے ہے

اس نے پتھر باندھ کر پھینکا ہمیں دریا میں یارو!
اب یہ اس کا پہچان لینا بہانہ سا لگے ہے

رات اب جیسے فضا میں اک صفِ ماتم بچھی ہو
چاند اب ٹوٹے ستاروں کا فسانہ سا لگے ہے

کوئی آوارہ پرندہ اس طرف شاید پھر آئے کہ
آج پھر موسم بدن کا کچھ سہانا سا لگے ہے

دندناتے ہیں کھلی سڑکوں پہ آدم خور گھوڑے
شہر کی تہذیب جنگل کا زمانہ سا لگے ہے

حالِ دل کہہ کر یہاں ہر شخص شرمندہ ہے طلعت
زندگی اس دور کی خالی خزانہ سا لگے ہے

خونی ہوا کے پنجۂ شہباز میں رہا
ہو کر لہو لہان میں پرواز میں رہا

بارش تو چاروں کھونٹ برابر رہی مگر
فصلوں کا رنگ مٹی کے اعجاز میں رہا

شب بھر چھتوں میں سازشیں بنتی رہی ہوا
گویا ہر اک مکان تگ و تاز میں رہا

جانے کہاں کہاں مجھے چھو کر گذر گیا
وہ لمس جو کہ آپ کی آواز میں رہا

دہلیز پر تھی آگ کی شاید کوئی لکیر
شب بھر کھڑا کھڑا وہ در باز میں رہا

انجام کار پہلو بہ پہلو چلے مگر
طلعت تمام عمر ہی آغاز میں رہا

یوں خود سری کو دعوتِ جذبِ اَنا نہ دے
تجھ کو ترے لہو کی تپش ہی جلا نہ دے

سر پر زمیں اٹھا کے نہ یوں آسماں پہ چل
تجھ کو کسی نگاہ کی رِفعت گرا نہ دے

پتھّر پہ ناخنوں سے لکیریں ہزار کھینچ
لیکن کسی خیال کو کچھ مدّعا نہ دے

منظوم قہقہوں کی عمارت میں یوں نہ گھوم
خونی حویلیوں کے مناظر بھلا نہ دے

لنگڑی حقیقتوں کے طلسمانہ دَور میں
سالم صداقتوں کے تصوّر مٹا نہ دے

پانی کی موت اصل میں سورج کی موت ہے
کالے سمندروں کو پلٹ کر صدا نہ دے

منسوب دائروں سے نہ کر ذات کا سفر
پیلنے کی وسعتوں کو نظر کا خلا نہ دے

حاسد کو میں حریف کا ہرگز نہ دوں مقام
جب تک وہ میرے نام کی طلعت صدا نہ دے

کٹی پتنگ جہاں کی تہاں پہ ٹھہری ہے
تمام شہر میں جیسے کہیں ہوا ہی نہیں

ہے میرے قتل کا دعویٰ اسے بجا لیکن
وہ میرے خون کا منظر تو دیکھتا ہی نہیں

کوئی یہ شہر کے شاعر سے جا کہے طلعت
غزل میں شعر بھی ہوتا ہے قافیہ ہی نہیں

خودکشی درد کی دوا تو نہیں
رُوح احساس سے جُدا تو نہیں

ضبط دل پر ہمیں رہا تو نہیں
پھر بھی آنسو کوئی بہا تو نہیں

گونجتا ہے جو دل میں سنّاٹا
یہ مری رُوح کی صدا تو نہیں

اجنبی آپ کے لئے ہوں مگر
آپ کے شہر میں نیا تو نہیں

ہر نظر اٹھ رہی ہے کیوں مجھ پر
میں ترے رُخ کا زاویہ تو نہیں

عشق میں بارہا ہوا محسوس
زندگی حسن کی ادا تو نہیں

اک نظر دشتِ دل کو دیکھ آؤں
پھول تازہ کوئی کِھلا تو نہیں

چل رہا ہوں میں جس پہ صدیوں سے
یہ ترے گھر کا راستہ تو نہیں

کیوں ترنّم سے ہے فضا لبریز
آج طلعتؔ غزل سرا تو نہیں

اپنے حصّے کی حقیقت پہ میں شرمندہ ہوں
اور کہنے کو مرا نام خداؤں میں بھی ہے

کتنا کرم ہے مجھ پہ غمِ حادثات کا
روشن ہوا ہے درد سے چہرہ حیات کا

دل ہے کہ اک مزار کا بجھتا ہوا چراغ
ہستی کہ ٹوٹتا ہوا مدفن حیات کا

بدبختیٔ حیات سے تنگ آ کے ایک دن
ہم نے طلسم توڑ دیا التفات کا

یا رب! تجھے تھی اپنی ہی شہرت سے کچھ غرض
ورنہ وجود کیا ہے تری کائنات کا

طلعتؔ! وہ دن دکھائے ہیں قسمت کی شام نے
میں چاند بن گیا ہوں اماوس کی رات کا

دھوپ میں کھلا ایسے، چاند سا جمال اس کا
چارسُو نظر آیا، حُسن لازوال اس کا

کوئی سا بھی رنگ اے دل! راس اب نہیں آتا
بس گیا ہے آنکھوں میں چہرہ پُرملال اس کا

کاکلِ حیات اپنی اس پہ بھی ہے گرد آلُود
آنسوؤں سے دھو ڈالا، ہم نے بال بال اس کا

وہ جب آگیا ضد پر، چپکے سے چلے آئے
ہم جواب کیا دیتے صاف تھا سوال اس کا

باندھئے تصوّر میں کس طرح اسے طلعتؔ!
چاندنی ادا اس کی، آسماں خیال اس کا

کوئی دیوار نگا ہوں میں نہ در باقی ہے
ایک صحرا ہے جو تا حدِ نظر باقی ہے

طے کئے جاتے ہیں ہم زیست کی منزل منزل
کچھ مگر ہے تو تری راھگذر باقی ہے

پیاس جنموں کی لئے پھرتے ہیں شہروں شہروں
کس سے پوچھیں کہ ابھی کتنا سفر باقی ہے

اڑتے پھرتے رہیں خلاؤں میں ہوا کے مانند
اب ہمیں کون سے آسیب کا ڈر باقی ہے

پھول جو گھر کے اندھیرے میں ٹنگا ہے کب سے
اس میں اس لمس کی خوشبو کا اثر باقی ہے

تیری تصویر کے رُخ دونوں اُجاگر ہم پر
پھر بھی شیشے میں کوئی عکس دگر باقی ہے

ملے جو مجھ کو کبھی فرصتِ بیاں تو کہوں
خموش ہو جو کبھی گنبدِ جہاں تو کہوں

ہوں زینہ زینہ طلسمِ خیال سے روشن
اُتر کے جاؤں یہاں سے سرِ زیاں تو کہوں

سکوتِ شمس پہ ظاہر ہے تمقمونکا مزاج
اڑیں کہیں سے پرندوں کی ٹولیاں تو کہوں

کھڑا ہے چھت پہ عیاروں سے کھیلتا ہوگا
ذرا منڈیر تک آ کر کہے وہ ہاں تو کہوں

میں اپنی پیٹھ سے باہر نکل چکا کب کا
جھکے اب آکے اسی تیر پر کماں تو کہوں

کہا ہے اس نے کہ اس پر بھی کچھ کہوں طلعت
ہو دسترس سے پرے کوئی داستاں تو کہوں

طلسمِ ہوش رُبا ہے جو کوئی سچ مانے
وہ آنگ انگ ادا ہے جو کوئی سچ مانے

بس اک عجیب تقدّس سا ہے دل و جاں میں
مجھے وہ چھو کے گیا ہے جو کوئی سچ مانے

یہ ٹہنیاں ہیں کہ گلشن بدست خوشبوئیں
یہ پیڑ خود ہی صبا ہے جو کوئی سچ مانے

ابھی تک آگ پھنسی ہے انہیں درختوں میں
ابھی یہ دشت ہرا ہے جو کوئی سچ مانے

گھبرا کے زندگی کے بھیانک سفر سے میں
ڈر ہے بھٹک نہ جاؤں تری رہگذر سے میں

مجھ کو مری نگاہ بھی کرتی نہیں قبول
کس درجہ گر گیا ہوں تمھاری نظر سے میں

اب ڈھونڈتے ہیں مجھ کو وہ گلیاں وہ راستے
گذرا تھا تیرے ساتھ جہاں سے جدھر سے میں

لازم تھا کارواں کے اصولوں کا احترام
آگے نکل سکا نہ کبھی راہبر سے میں

لاتا نہ آسماں کے فرشتوں پہ اعتقاد
ہوتا نہ بدگماں جو زمیں پر بشر سے میں

طلعت پھر انکو خواب میں دیکھا ہے آج اداس

پھر مضطرب ہوں رات کے پچھلے پہر سے میں

عشق آگ کا دریا بھی جو بن جائے تو کیا ہے
خود حسن کا سایا مری پوشاک بنا ہے

ہر چند مرے سر کی قسم کھائی ہے لیکن
صد شکر کہ تم نے کوئی وعدہ تو کیا ہے

اب آپ کی نظروں میں بھلا کون نچیے گا
اب آپ نے آئینہ کا منھ دیکھ لیا ہے

اس قتل گہِ دہر میں جینے کے بہانے
ہر شخص خود اپنا ہی لہو چاٹ رہا ہے

سکّوں کی جدا بات ہے اس دور میں ورنہ
بکنے کو زمانے کا ہر اک شخص بکا ہے

طلعت کو تم اپنے محض اچھّا نہ سمجھنا
اچھّوں سے وہ اچھا ہے بُروں سے وہ بُرا ہے

چاروں طرف جو ہم پہ برستا ہے آئینہ
اِک خواب ہے کہ خوابِ شکستہ ہے آئینہ

چاہوں اسے تو ٹوٹ کے ہوتا ہے چور چور
دیکھوں اگر تو آنکھ کو ڈستا ہے آئینہ

پہلے تو ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا
اب گھر کی صورتوں کو ترستا ہے آئینہ

میرے تمہارے عکس بھی ٹکڑوں میں بٹ گئے
کس درجہ زندگی کا شکستہ ہے آئینہ

شیشہ گری کے نام پہ اکثر وہ مہ جبیں
تارِ نگاہِ ناز پہ کستا ہے آئینہ

جس میں کہ ہر کسی کا ہے یوسف چھپا ہُوا
بازارِ مصر کا وہی رستہ ہے آئینہ

طلعتؔ ! ہمیں وہ دُور سے دیکھے ہے آر پار
کیا بوالہوس کی آنکھ میں بستا ہے آئینہ

آپ سے ہم مل لئے اچھّا ہوا
ورنہ یہ ہوتا کہ جانے کیا ہوا

شب وہاں پاپیوں کا جشن تھا
میں بھی جتنا ہو سکا چھوٹا ہوا

مجھ کو دے ڈالا جہاں نے اک وجود
ورنہ میں ہو کر بھی کب پیدا ہوا

جس قدر بڑھتی گئی شہروں کی بھیڑ
اس قدر ہر آدمی تنہا ہوا

وہ، ہمارا منتظر تو تھا مگر
ہم وہاں پہونچے تو وہ چلتا ہوا

گھاؤ ایسا لگا کہ یاد رہے
اس طرح مسکرا کہ یاد رہے

حال کیا پوچھتا ہے یار دل کا
اٹھ کے ایسے نہ جا کہ یاد رہے

اب یہ آنسو نہیں پئے جاتے
آج اتنا رُلا کہ یاد رہے

پھر تمنا کو دے نگاہ کی لو
پھر وہ منظر دِکھا کہ یاد رہے

دھڑکنوں میں سما بھی جا اٹھ کر
دل سے دل یوں مِلا کہ یاد رہے

تجھ کو طلعت ابھی نہیں سنا کب سے
اب کچھ ایسا سنا کہ یاد رہے

سبز نیلی سرخ کالی بوتلیں
ہیں بہت رنگین خالی بوتلیں

پی پلا کر یار لوگوں کا لہو
کرنے بیٹھی ہیں جگالی بوتلیں

کچھ پرندے چھپ سے پانی پر گرے
اور اُڑے بن کر سوالی بوتلیں

دیکھئے! پھر آج خالی جیب پر
دے رہی ہیں، ہم کو گالی بوتلیں

میکدہ اُلٹا لٹک جائے اگر
ناچنے لگ جائیں خالی بوتلیں

کیا ہی اچھا ہے ملاوٹ کا اثر
بند ہو کر بھی ہیں خالی بوتلیں

جہاں کو چھوڑ کے چل دیں فقیر ہو جائیں
جو تم کہو تو خدا کا ضمیر ہو جائیں

وہ خود ہمیں سے چراتا پھرے نظر اکثر
جو ہم کسی کی نظر میں حقیر ہو جائیں

بنیں گے خود ہی کبھی گھومتی ہوئی مچھلی
جو لوگ چشمِ تمنّا کے تیر ہو جائیں

جہاں میں بانٹ دیں خود کو بصورتِ خیرات
ہم ایسے لوگ جو دل کے امیر ہو جائیں

وہیں سے دیجئے دنیا کو اک نگاہِ دگر
تمام رنگ جہاں دلپذیر ہو جائیں

لکھے گئے ہیں خلا میں کہ جو کوئی پوچھے
ہم اس کے ہاتھ کی طلعت الکیر ہو جائیں

کپاس خُون میں تھی جسم پر لحاف نہ تھا
مرا وجود کہ بستر کو بھی معاف نہ تھا
ہماری نیند کو تکیہ نہ تھا ستاروں تک
کیا جو رات کو تکیہ تو اب غلاف نہ تھا
صدق دلی کہ نیا مشغلہ تھی شہروں کا
کسی زباں پہ کوئی حرفِ اختلاف نہ تھا
اسے تمہارے سوا کوئی کیا سمجھ پاتا
جو ہر کسی سے الگ تھا مگر خلاف نہ تھا
بنائے ردِ عمل تھا ہر اک عمل میرا
زمیں پہ رہ کے مجھے آسماں معاف نہ تھا
تماشبین تھا صحرا مری مسافت کا
کہ مجھ کو آبلہ پائی کا اعتراف نہ تھا

غزل اُنق پہ تھی طلعت کہ ہم سمجھتے تھے
بہت بُلند تھا مطلع اگرچہ صاف نہ تھا

کیا طلب ہم کو بوقتِ شام ہے
جسم و جاں میں پھر کوئی کہرام ہے

ہم وہ آوارہ پرندے ہیں جنھیں!
ہر کہیں آرام ہی آرام ہے

رات آتش داں کے دم پر کاٹ لو
دن تو برفیلی ہوا کے نام ہے

چاند ہے پیاسی ہتھیلی رات کی
ہر ستارہ ایک خالی جام ہے

عشق اپنی وجہ رُسوائی کہاں
وہ تو کوئی اور ہی الزام ہے

تیرا! اے! تنگ نگاہ دوستی
سُرخ رو ہونا خیالِ خام ہے

مِلی ہے کیسی گناہوں کی یہ سزا بابا!
کِسی فقیر کی لگتی نہیں دُعا بابا!

تری طرف سے تو کوئی کمی نہ تھی لیکن
میں اپنے آپ سے بچ کر نہ چل سکا بابا!

پھر اس کے بعد ہمیں یہ جہاں مِلے نہ مِلے
بس ایک سانس ترے نام کی صدا بابا!

یہ کم زیادہ کا احساس ہی تو ہے ورنہ
کسی کے پاس کبھی کچھ نہیں ہوا بابا!

یہ بات چھوڑ کہ دیتا ہے کیا نہیں دیتا
مگر تو اس کی طرف ہاتھ تو اُٹھا بابا!

کہیں نہ میں ہوں نہ تو ہے نہ زندگی ہے نہ موت
بس ایک نام کا سارا ہے معجزہ بابا!

کہاں وہ لوگ کہ دیتے تھے بھیک میں خوشی دکھ
کہاں یہ شہر کہ مانگے نہ مدّعا بابا!

وہ کون ہے جو ستاروں کے پار بستا ہے
مجھے بھی اس کی کہانی کوئی سُنا بابا!

ریل کے رُکتے ہی وہ دھچکا لگا
ہر کوئی چھت سے اُچھل کر جا لگا

اک ٹہنی گری تالاب میں
اس پہ ڈیرہ خشک پتّوں کا لگا

رات سڑکوں پر ہوئی لفظوں کی موت
شہر آوازوں کا اک صحرا لگا

بند کمروں میں اڑا اپنا مذاق
اس گلی کے نام پر بٹّہ لگا

چھوڑ طلعتؔ! جسم کا نیلام گھر
در پہ اپنے نام کا تالا لگا

اگر یہ سچ ہے کہ ہم بھی وفا شعار نہیں
تو اس جہاں میں کسی کو کسی سے پیار نہیں

صلہ یہ کم تو نہیں تیرگی میں جینے کا
کہ میرے سائے پہ سورج کو اختیار نہیں

طلسم جادۂ منزل تو ہم نے توڑ دیا
سفر کے درد سے ممکن مگر فرار نہیں

مٹا کے مجھ کو بنا بارہا ابھی اے دوست!
ابھی میں تیرے تخیّل کا شاہکار نہیں

ہے ایک نور کا دریا سا موجزن دل میں
کہیں میں تیری نظر سے تو ہمکنار نہیں

کچھ اور بات بھی طلعت! ضرور ہے اس میں
دل اس کے جسم کی خوشبو ہی پہ نثار نہیں

میری دستک پہ جو بھی در کھُلا ہے
مجھے خود میں مقفّل کر گیا ہے

تم اپنا زہر اب کس پر جیؤ گے
مرا احساس تو مٹّی ہوا ہے

تم اپنی شبنمی سانسوں کو روکو!
مرا ہر بول پھیکا ہو چلا ہے

چٹخ جاتے ہیں شیشے روزنوں کے
ہوا بازی کہاں کا مشغلہ ہے

جُڑو گے کس طرح طلعت سے یارو
جو خود سے ٹوٹ کر جیتا رہا ہے



طلعت عرفانی

کے

دوسرے مجموعۂ کلام

"تعارف"

کا

انتظار کیجئے ۔

Only Cover Printing
at Block Printing Press DELHI-6.